اردو غزل میں ترسیلِ معانی کے غیر لسانی مشارات

محمد رؤف
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد

PARA- LINGUISTIC SIGNIFIERS OF COMMUNICATION IN URDU GHAZAL

Muhammad Rauf, PhD
Assistant Professor of Urdu
Govt. P/G College Samanabad, Faisalabad

Abstract

Urdu ghazal having been equipped with its diverse expressive devices is known as sinf-e-hazarshewa. There is a unique technique in this genre for the expression of thoughts and feelings by exploiting non-linguistic signifiers instead of words and phrases.This method of acquisition and expression of thoughts and feelings through signal-based communication mode is an old technique of our linguistic system. Moreover, such para-linguistic communication methodology, being closed to nature is proving out to be more effective and eloquent than traditional expressive devices. In the wake of this old expressive system, an organized poetics exist just like the traditional modes of our linguistic expressions. In Urdu, such unique method of expressions still exists in today's ghazal. The article discusses the ideological and applied aspect of this particular mode of expression.

Keywords:

سوسئیر، داغ دہلوی، غالب، خالد احمد، اردو غزل، اسلوبیاتِ میر، فیصل آباد، علم البیان، قلم سے روشنی پھوٹے

بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

اردو کی نوع بہ نوع شعری اصناف میں جذبات و افکار کی ترجمانی کے لیے صنفِ غزل کو ابتدا ہی سے ایک مظہر العجائب ذریعۂ اظہار کا درجہ حاصل رہا ہے۔ اس کی لچک دار شعریات کی بدولت ہمارے متغزلین شعرا معنی کی کئی سطحوں کو نوع بہ نوع قرینوں سے بیان کرنے میں چنداں دشواری محسوس نہیں کرتے۔ فکر و احساس کی اسی رنگا رنگی کے سبب اس صنفِ سخن کو "ہمارا تہذیبی عرف"، "ثقافتی نسب نامہ" اور "صنفِ ہزار شیوہ" جیسے القابات سے بھی جانا جاتا ہے۔ رمز و استعارہ کی ایمائیت اس سحر بیان صنفِ سخن کے اسلوبیاتی خدوخال کا لازمہ خیال کی جاتی ہے۔ مزید برآں اس صنف کی ہیئتی ساخت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس میں تسلسلِ خیال کے بجائے معنوی تنوع کا اہتمام یقینی بنایا جاتا ہے، جس کی بنا پر عہدِ رواں کے ایک ناقد نے اس کے مخصوص اسلوب پر قرآن سے مستعار ہونے کا التباس ظاہر کیا ہے (۱) کہ جس میں الوہی شانِ تخلیقیت کے ساتھ ساتھ علمِ بیان کے اعلیٰ ترین وسائل کچھ یوں در آئے ہیں کہ اس کے سخت ترین مخالف بھی اسے "سبعہ معلقات" میں شامل کرنے پر مجبور ٹھہرے۔ اس پُر حکمت کتاب میں تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی "علمہ البیان" (۲) کہہ کر انسان کے ایک کلیدی ما بہ الامتیاز کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی امتیازی وصف کی بنا پر یونانی دانش وروں نے اسے "حیوانِ ناطق" قرار دیا تھا۔ ظاہراً تو بیان یا نطق کی یہ سرگرمی ہماری گوشت پوست کی بنی زبان (Tongue) کے ذریعے روبہ عمل آتی ہے، مگر فی الاصل گوشت کا یہ لوتھڑا خود بھی ایک ذریعہ یا واسطہ ہے اس مخصوص اور منظم صوتی نظام یعنی زبان (Langue) کا، جس پر اس سماج کے لوگ روایتی طور پر اتفاق کر چکے ہوتے ہیں اور یہی صوتی نظام علمِ لسانیات میں ہماری تحقیقات کا موضوع بنتا ہے۔ ایسے مطالعات میں اشاری زبان یا اظہارِ مدعا کے کنایاتی قرینوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ ان ایمائی ضابطوں میں ترسیل و تحصیلِ معنی کے نہایت گہرے امکانات مخفی ہوتے ہیں۔

فی زمانہ معروف لسانی مفکر سوسیئر نے زبان کو "نشانات کا نظام" قرار دے کر ایسے اظہاری قرینوں کو معاصر لسانی ڈسکورس کے مرکز میں لا کھڑا کیا ہے۔ مذکورہ مفکر کے مطابق زبان ایک ثقافتی تشکیل ہے، لہٰذا اس کے تمام تر نشانیاتی نظام کو معاصر ثقافتی اقدار و روایات کے تابع رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لسانی دانش کی رو سے تحریری زبان کے علاوہ ہر وہ شے، منظر، یا کوئی عملی صورت بھی عین متعین ہو سکتی ہے جو رمزیہ معنویت کی حامل ہو اور متعلقہ شعریات کی روشنی میں اس کی معنوی ابعاد متعین کی جا سکیں۔ اس طرح یہ لسانی فلسفہ ہر ثقافتی مظہر کو ایک معنوی نظام (System of Signification) کے طور پر جانتا اور اس کی تعینِ قدر کا اہتمام کرتا ہے۔ اس میں ہر ثقافتی مظہر کو لفظ کے بجائے نشان (Sign) خیال کیا جاتا ہے جس کی مراد وی عمل داری کا احاطہ

کرتے ہوئے ایک مغربی مفکر راس مرفن نے لکھا ہے:

"For structuralists, any thing that people do or use to communicate information(of any type)to others, is a sign"(3)

اس لسانی تھیوری کی رو سے ہر تخلیق کار اپنے فکر و احساس کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف نوعیتوں کے ذرائع اظہار(Expressive Devices)روبہ عمل لاتا ہے جس سے روزمرہ کی عام زبان غیر معمولی اظہاری عمل(Uncommon Act of Expression)سے ہم آہنگ ہو کر ادبی اظہاریے میں ڈھل جاتی ہے۔ایسا فن کارانہ اظہار وابلاغ جن نت نئے طریقوں اور ایمائی پیرایوں سے مرتب ہو پاتا ہے، ان میں غیر لسانی قرائنِ اظہار کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو اپنی عمل داری میں بالکل صوتی اشاروں کی طرح کام کرتے اور فطرت سے قریب تر ہونے کے سبب اپنی بلاغتی سرگرمیاں موثر تر انداز میں نبھاتے ہیں۔یہ اظہاری تکنیک بالخصوص دو قسم کے تعاملات پر محیط ہوتی ہے:

- اخذِ معنی کے غیر لسانی عوامل
- خیال کے غیر لسانی عوامل

یہاں اوّل الذکر عوامل وہ ہیں جن میں ہم کسی چیز،قدر یا رویئے سے کوئی خاص ایمائیت کشید کرتے ہیں۔یوں تو شاعر عموماً سکوتِ لالہ و گل کے جیسی علامات سے بھی کلام پیدا کرتا نظر آتا ہے اور استعارہ و کنایہ کی دیگر نوع بہ نوع اقسام سے بھی،مگر یہاں ہم اپنی بحث ایسے غیر لسانی عوامل تک محدود رکھیں گے جن کا اظہار باقاعدہ متحرک تعاملات کے ذریعے روبہ عمل آتا ہے۔اسی طرح ترسیلِ مطلب یا مدّعا کاری میں ایسے مخصوص ایمائیت کے حامل عوامل و مظاہر زیرِ بحث آئیں گے جو لفظ کی طرح ہماری عجمی لسانیات کا حصہ بنتے اور اظہار وابلاغ میں اپنا بھرپور تعامل نبھاتے ہیں۔مختلف چیزوں اور بدنی اشاروں پر مشتمل ایک مستقل کائناتی زبان صدیوں دنیا میں مروج رہی ہے، جو لسانیات کے پہلو بہ پہلو مخصوص قوانینِ اظہار وابلاغ کی حامل تھی اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہی زبان انسانی تکلم کی قدیم ترین شکل بھی رہی، جس کے کچھ نہ کچھ آثار مذکورہ دونوں اظہاری پیرائیوں میں ہنوز قائم چلے آرہے ہیں۔اردو غزل میں اس موثر اظہاری قرینے کی دونوں جہتیں بڑی کامیابی کے ساتھ تخلیقی عمل کا حصہ بنتی رہی ہیں۔اس ضمن میں کلامِ میر سے ایک مثال دیکھیے:

کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اس شعر کا مرکزی خیال تو محض زندگی کی بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے، لیکن تمثیلی پیرائے میں ایک جان دار اور بے جان میں مکالمہ کروا کر اس معمولی بات کو تخلیقی نشتریت عطا کر دی گئی ہے۔معروف ناقد گوپی چند نارنگ اس شعر کی داخلی ساختوں کے شعری تفاعل کا انشراح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔کلی اس کا جواب نہیں دیتی بس سن کر تبسم کرتی ہے۔تبسم کرنا کی داخلی ساخت ہے کھل کر پھول بننا، اور کھل کر پھول بننا کی داخلی ساخت ہے اوجِ کمال تک پہنچنا، اور اوجِ کمال پر پہنچنے کی داخلی ساخت ہے زوال کی طرف راجع ہونا۔۔۔کلی کے مسکرانے کے عمل میں کئی دوسری معنیاتی ساختیں بھی ہیں۔یعنی جو بات پوچھنے کی نہ ہو اس پر بھی مسکرا دیتے ہیں۔گویا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات کتنا ہے۔۔۔یہ مسکراہٹ تحقیر آمیز بھی ہو سکتی ہے کہ بھئی سامنے کی بات ہے کہ گل کا ثبات بس اتنا ہے جتنی دیر میں کلی کھل کر پھول بنتی ہے۔''(۴)

یہاں منہ بند کلی کا محض ہلکے تبسم سے اظہارِ مدعا کرنا شاعر کے سوال کا ایک ایسا جواب نامہ ہے کہ جس کا جواب نہیں۔بقول داغ دہلوی: ع ''بات کی یوں کہ جیسے کی ہی نہیں''۔شاعر نے پھول کی عمرِ طبعی پر سوال اٹھایا تھا، مگر جوابی ردِ عمل کلی کی طرف سے آ رہا ہے۔تانیثی حوالے سے اس پر مزید بحث نکلتی ہے۔یہاں یہ بھی متعین نہیں کہ کلی کا روئے متبسم شاعر کی طرف تھا یا مسئول یعنی پھول کی طرف، یا پھر وہ دل ہی دل میں مسکرا کر کسی اپنے غم کی پردہ پوشی کر رہی تھی۔بہر حال ایک نیم جاں وجود کا لفظوں کے بجائے اپنے عمل سے یوں جواب دینا تمثیل اور تجسیم کی فنی لطافتیں سمیٹتے ہوئے پیرایۂ اظہار کی رفعتوں کو پا لیتا ہے۔ظاہر ہے یہاں شعر کی خارجی ساختیں اپنے داخلی انسلاکات (Connotations) کے حوالے سے سماجی معنویت پر بھی دال ہیں اور یوں گل کا استعارہ حسن و شباب اور دنیاوی عیش و نشاط کی ترجمانی بھی کرنے لگتا ہے۔میر کی طرح اردو کے دیگر بہت سے پختہ گو شعرا نے بھی اس پیرایۂ اظہار میں دلچسپی دکھائی ہے۔چند مثالیں ملاحظہ کریں:

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال سنایا نہ جائے گا (میر)

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے (غالب)

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے ہوا نے اڑا دیا (مصحفی)

وقتِ رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل (عابد علی عابد)

میں نے کہا کہ چاند نکلتا ہے کس طرح
زلفیں گرا کے چہرے پہ جھٹکا دیا کہ یوں (نامعلوم)

محفلِ غیر میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا (حسرت)

مانگا جو میں نے بوسا انگوٹھا دکھا دیا
اتنے بڑے سوال کا یہ مختصر جواب (صوفی تبسم)

ان اشعار میں ہم ''زبانِ بے زبانی'' کے سحر کار ترسیلی نظام میں فکر واحساس کی ترجمانی کا ایسا تعامل دیکھتے ہیں جس کا اہتمام عمومی زبان کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی شاید ممکن نہ ہو پائے۔ ایسے غیر لسانی مشاروں میں استعاراتی قوت اس قدر منہ زور ہوتی ہے کہ ان پر خود تخلیق کار بھی اپنی اجارہ داری قائم نہیں کرسکتا۔ دراصل یہاں غیر لسانی اشاروں کا جو پیرایہ اظہار روبہ عمل لایا جا رہا ہے، اس سے ہمارے بصری قویٰ (Visual Senses) پوری شدت سے اخذ معنی کے لیے رویت تعامل (Functioning Vision) سے گزرتے ہیں اور مسلمہ بات ہے کہ یہ قویٰ ہمارے سمعی حسیات سے کہیں زیادہ بڑھ کر لطیف اور زود حس ہوتے ہیں۔ چوں کہ اشاراتی قرینہ ابلاغ اپنی اقلیم میں براہِ راست ''فطری زبان'' سے علاقہ رکھتا ہے اس لیے یہاں معنی کی ترسیل وتحصیل کا عمل زیادہ صاف، فصیح اور بلیغ ہوتا ہے۔ فارسی کہاوت: شنیدہ کہ بود مانند دیدہ، اسی امر کی صوابت کا اشارہ ہے۔ تمثال کاری کے ذریعے اظہار مدعا کی تکنیک بھی اسی قبیل کی ایک کاوش ہوتی ہے۔ اس سے کلام میں کمال کی تخلیقی لطافت در آتی ہے اور یوں شعر اپنی خارجی ہیئت اور حتیٰ کہ لفظیات تک بھول جانے کے باوجود ہماری آنکھوں کے سامنے محاکاتی پیکر کی صورت رقص کناں رہتا ہے۔ اس ضمن میں ایک مثال دیکھیے:

زمیں پہ ننھے منّے پاؤں کے نشان ہیں
کنارِ بحر ریت کا مکان بن کے مٹ گیا

کچھ اسی نوع کا تجربہ مخمور جالندھری کی اس باکمال نظم میں کیا گیا ہے:

کون ایسا سحر کار ابھی گزرا یہاں سے
ہاتھوں میں ہے بنیے کے اسی طرح ترازو
درزی کی سوئی پہلے جہاں تھی ہے وہیں پر

یہ محاکات اور ساکت تصوراتی پیکر (Still Pictures) زبان کی تخلیقی نشتریت کو اس قدر ابھار کر پیش منظر پر لاتے ہیں کہ غالب کے ایک مصرعہ ع ''سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہاں شاعر محاکات اور پیکر تراشی کا ایسا جادو جگا رہا ہے کہ اس سے متعلقہ شے اور واقعے کی سنائے اور

سکوت میں لپٹی نادر حسیاتی جمالیات بھی قائم رہتی ہے اوراس کے ساتھ ساتھ ایک ماورا معنویت کا ارتعاش بھی ہمارے بصری کینوس پر مرتعش ہوتا چلا جاتا ہے۔سنسان کھنڈروں میں پر مگس کی آواز بھی شہنائیوں کی طرح گونجتی ہے اور خستہ دیواروں کی دراڑیں دیدہ عبرت نگاہ کی صورت جمود کی باطنی حرکیات کا تماشا کرتی ہیں۔کچھ اسی طرح شعروادب میں بھی غیر لسانی مشارات (Signifiers) کسی شوخ کے V نما گریباں کی طرح مشارالیہ (Signified) کی باطنی جمالیات کا روزن ثابت ہوتے ہیں؛ بقول شاعر:

می دہد رخنہء دیوار ز گلزار خبر
لطفِ اندامِ تو از چاکِ گریباں پیداست

اردو شعرا نے غیر لسانی مشاروں کے ایمائی امکانات کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔چوں کہ شاعری اور بالخصوص غزل میں رمزوایما ہی شعریات کے بنیادی پتھر کی طرح روبہ عمل رہتی ہے اس لیے یہاں ایسے "کہی ان کہی" کے حامل مشاروں کی کلیدی اہمیت بنتی ہے۔خالد احمد نے ایک جگہ یہی بات یوں کی ہے: "میرے نزدیک شعر بات کہنے کا سلیقہ نہیں،بات چھپا جانے کا ہنر ہے۔"(۵) ان کہی کے اسلوب میں بات کہہ جانے کی ایسی ہی دو مثالیں دیکھیے:

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگرِ کشتی و ناخدا خفت است (غالب)
جا پڑوسی کے گھر کی آگ بجھا
آگ کا کچھ پتہ نہیں ہوتا (اقبال متین)

ان اشعار میں رمزیہ اظہاری قرینہ اس فنی چابک دستی سے روبہ عمل آیا ہے کہ ایجاز واختصار کے ساتھ ساتھ معنوی تاثر میں بھرپور شدت در آئی ہے۔البتہ یہ پیرایہء اظہار غیر لسانی مشاروں کی پروردہ ایمائیت کے بجائے صورتِ حال کے تناظر میں معنی آفرینی (Situational Expression) کے ذیل میں آتا ہے جو زیرِنظر موضوع کی محض ایک فرع ہے۔ایسے تمام اظہاری پیرایوں کی فنی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

"محاکات نگاری شعر کے فنی محاسن کا سب سے زیادہ متاثر کرنے والا عنصر ہے۔بڑا شاعر تمثال کی زبان میں بات کرتا ہے: ساکن تصویریں، متحرک تصویریں،ڈرامائی تصویریں وغیرہ۔یہ تصویر شعر کے معنوی منظر کو قاری کی آنکھوں کے سامنے لے آتی ہے۔اس سے شعر کی زیب وزینت بھی بڑھتی ہے اور اس کی تاثیر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔"(۶)

اظہار وابلاغ کے غیر لسانی مشاروں کے حوالے سے بعض اشیا،اعمال،رویے یا حالات وواقعات کی

صورتیں مقامی شعریات کا حصہ بن کر اجتماعی حافظے میں اپنا مقام بنالیتی ہیں اور یوں شعروادب میں ان کا تخلیقی استعمال اور قرائنی تعامل ممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔اس حوالے سے چند اشعار:

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا
بے چارہ گریہ ناک ، گریباں دریدہ تھا(میر)

نامہ بھی لکھتے ہو تو بہ خطِ غبار حیف
رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف(غالب)

بال ہیں بکھرے، رنگ ہے پھیکا، کان میں ٹوٹا بالا ہے
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے(جرأت)

نہ ہم سمجھے ، نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے(نامعلوم)

اردوغزل کی شعریات جن ماخذی زبانوں سے مل کر مرتب ہوئی ہے ان میں شاعری کونظریات وافکار کی ترسیل سے کہیں زیادہ جذبات واحساسات کے اظہار کا ذریعہ خیال کیا جاتا ہے،جس کی بناپر اس کی کلیدی شناخت ڈرامائی نوعیت کی رہی ہے۔دراصل اس نوع کے غیر لسانی مشاروں سے ایک خاص نوع کا لطیف،دوٹوک اور براہِ راست قسم کا ایسا حِسّی تجربہ روبہ عمل آتا ہے جسے انگریزی اصطلاح ''The Grand Style'' کے مترادف قرار دیا جا سکتا ہے۔ہم تحصیلِ علم میں سب سے زیادہ حسِ باصرہ پر انحصار کرتے ہیں اور مذکورہ مشاروں میں بننے والے تصویری پیکر اس حس کی عمل داری کے لیے خصوصی موزونیت کے حامل ہوتے ہیں۔الغرض اس نوع کا مقرون قرینۂ اظہار(Picturesque Mode of Expression)ہماری شعری اقلیم کا ایک اہم ضابطۂ کار ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) فتح محمد ملک: انداز نظر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۳۶

(۲) قران پاک کی مذکورہ دونوں آیات کا ترجمہ یوں ہے: ''(وہ رحمان ہے جس نے ـــ) انسان کو پیدا کیا اسے علم بیان سکھایا'' سورہ الرحمن: آیت ۳،۴

(۳) راس مرفن: The Bedford Glossary of Critical and Litrary Terms، نیو یارک: سدرن میتھوڈسٹ یونی ورسٹی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۸۰

(۴) نارنگ، گوپی چند: اسلوبیاتِ میر، مشمولہ: کلیات میر، جلد اوّل، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، طبع سوم، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱۵

(۵) خالد احمد (فلیپ): ہتھیلیوں پہ چراغ، لاہور: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۸۷ء

(۶) ریاض مجید، ڈاکٹر، دیباچہ، مشمولہ: قلم سے روشنی پھوٹے، شاعر: اکرم باجوہ، فیصل آباد: نعت اکادمی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱

❁❁❁